افادات مولانا عبدالعزیز میمنؒ

● ——— پروفیسر سید محمد سلیم

راقم الحروف نے طالب علمی کے دو سال ۴۶-۱۹۴۵ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں گذارے۔ مولانا عبدالعزیز میمن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت حاصل کی اور عربی زبان میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ یوں تو دوران سبق بھی استاذ مرحوم مختلف نوع کی معلومات سناتے رہتے تھے، مگر خصوصیت کے ساتھ شام کی سیر کے موقعہ پر تو وہ ہزار ہا قسم کی معلومات کے موتی بکھیرتے رہتے تھے۔ راقم شام کی سیر میں اکثر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس لئے راقم کے حافظہ میں ان کی بہت سی باتیں محفوظ ہیں۔ دوستوں اور احباب کا تقاضا ہوا کہ میں اپنی یادداشت کو افادہ عام کے لئے شائع کر دوں۔ میں اپنی یادداشت کو ملفوظات کے طریقے پر مرتب کرنے میں زیادہ سہولت محسوس کرتا ہوں۔

تعلیم

فرمایا میرے دادا لشکر گوالیار (چھاؤنی) میں دوکان دار تھے۔ وہاں کی مسجد کے مولوی صاحب تقریر کرتے تھے اور قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ میرے دادا مرحوم ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کے بعد انہوں نے طے کیا کہ میں اپنی کسی اولاد کو عالم دین بناؤں گا۔ اس لئے مجھے ابتدا ہی سے علم دین کی تحصیل پر لگا دیا۔ فرمایا میں نے ابتدائی تعلیم راجکوٹ گجرات میں حاصل

کی ہے۔ ایک مرتبہ مزاحاً فرمایا راجکوٹ نے دو بڑے آدمی پیدا کئے ہیں: موہن داس کرم چند گاندھی اور عبدالعزیز میمن۔

فرمایا گجرات میں میرے ہم سبق مولوی عبداللہ سورتی تھے۔ عربی لغت اور نحو میں مولوی عبداللہ کسی درجہ میں مجھ سے کم نہیں تھے۔ ان کا علم ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔ میں انگریزی مدارس میں چلا آیا۔

فرمایا مولوی عبداللہ میرا حریف تھا، میرا مدمقابل تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اب جینے کا مزہ نہیں رہا۔ پھر جریر کا ایک شعر پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ "آگ کا شرارہ دو پتھروں کے رگڑنے سے جھڑتا ہے، تنہا نہیں۔ اب فرزدق مرگیا۔ اب میرا شناسا کون ہے"۔ فرمایا میرا بھی یہی حال ہے۔ مولوی عبداللہ کے بعد اب بحث کا مزہ نہ رہا۔

فرمایا میں نے دہلی میں ڈپٹی نذیر احمد سے عربی کی تحصیل کی ہے۔ میں مسجد کے حجرہ میں رہتا تھا، مسجد کی روٹی کھاتا تھا۔ صبح ڈپٹی صاحب کے مکان پر پہنچ جاتا تھا۔ پہلے ان کا حُقّہ بھر کر سامنے رکھتا تھا، تب درس شروع ہوتا تھا۔ (واضح رہے کہ میمن صاحب خود بھی حُقّہ نوشی کے بڑے شوقین تھے)۔ میں ان کے گھر میں کام کرتا تھا، گھر کا مصالحہ پیستا تھا۔ (واضح رہے کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے بھی اپنے استاد کے گھر میں مصالحہ پیسا تھا اور اس لڑکی سے مار کھائی تھی جو بعد میں ان کی بیوی بنی)۔ ڈپٹی صاحب کی عربی دانی بہت بلند تھی۔ ان کو عربی کے بہت سے اشعار یاد تھے۔

فرمایا درسی کتابیں میں خرید نہیں سکتا تھا، اس لئے ان کو نقل کرتا تھا۔ رات میں نقل کرتا تھا اور دن میں پڑھتا تھا۔ اس زمانہ میں حکیم نورالدین بھیروی خلیفہ قادیان دہلی میں آئے۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ عربی نحو کا ایک نایاب رسالہ ان کے پاس ہے۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا وہاں ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ دینی بحث مباحثہ کا سلسلہ چل رہا تھا۔ میں ایک گوشہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو حکیم صاحب میری جانب متوجہ ہوئے کہو

صاحبزادہ تمہیں کیا اشکال ہے؟" میں نے عرض کیا "مجھے کوئی اشکال نہیں ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ کے پاس عربی نحو کا فلاں رسالہ موجود ہے۔ میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں" انہوں نے پہلے میری شکل دیکھی اور کہا "ہاں، وہ رسالہ موجود ہے اور یہاں بھی کتابوں کے صندوق میں موجود ہے۔ مگر میں آپ کو نہیں دے سکتا" میں نے عرض کیا "میں آپ کے سامنے اس کو پڑھوں گا اور نقل کروں گا" حکیم صاحب اس کے لئے راضی ہو گئے۔ دوسرے روز میں علی الصبح وہاں جا پہنچا۔ سارا دن لگا رہا اور شام تک میں نے اس کو نقل کر لیا۔

استاذ محترم کا خط بہت پختہ تھا۔ کاتبوں کی مانند لکھتے تھے۔ عربی بی۔اے کورس پنجاب یونیورسٹی میں درج شدہ شعراء اور مصنفین کے حالات پر انہوں نے ایک رسالہ چھپوایا تھا اس کی کتابت خود کی تھی۔ آخر میں لکھا ہوا ہے کتبت ھذا بخط عبدالعزیز المیمنی کرمہ اللہ تعالیٰ ۲۶ مارچ ۱۹۲۴ء۔ صفحہ اوّل غائب ہے۔ نہ کتاب کا نام معلوم، نہ مطبع اور شہر کا نام معلوم۔ ممکن ہے "تراجم" (مصنفوں کے حالات زندگی) نام ہو۔

فرمایا ایک زمانہ میں صحاح جوہری (لغت کی کتاب) میرے سرہانے رکھی رہتی تھی۔ روزانہ سونے سے قبل ۱۰۔۵ مصادر کے اوزان یاد کر کے سوتا تھا۔ میں صحاح جوہری کا حافظ ہوں۔ (عربی داں حضرات سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مصادر کے اوزان سماعی ہیں۔ ان کا انحصار حافظہ پر ہے۔ اکثر اہل قلم یہاں غلطی کر جاتے ہیں)

فرمایا درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد بعض طلبہ نے ترغیب دی کہ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنا چاہیئے۔ بعض لڑکے اس امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ ان کے ساتھ امتحان میں بیٹھ گیا۔ جب نتیجہ نکلا تو اللہ کے فضل سے میری اوّل پوزیشن تھی۔

ملازمت

فرمایا ۱۹۱۳ء میں کنگ ایڈورڈ کالج پشاور قائم ہوا۔ وہاں کے پرنسپل مسٹر مارٹن کو عربی زبان کے استاد کی ضرورت تھی۔ انہوں نے استاد کے لئے پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع پرنسپل اورینٹل

کالج لاہور کو لکھا۔ میں نے اسی سال مولوی فاضل کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ مولوی محمد شفیع مرحوم نے میرا نام اور پتہ ان کو بھیج دیا اور مجھے لکھا کہ آپ پشاور چلے جائیں۔ میں وہاں پہنچا۔ مارٹن نے میرا انٹرویو لیا۔ اس نے پوچھا۔ "کتنی تنخواہ لوگے"۔ میں نے کہا "پندرہ روپیہ"۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ بڑی رقم تھی۔ مارٹن نے کہا "نہیں ہم آپ کو ۵۰ روپے تنخواہ دیں گے"۔ اس وقت لیکچرار کی تنخواہ ۵۰ روپے تھی۔

فرمایا پشاور میں مجھے مغربی طریقہ تعلیم کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ میں نے وہاں خوب لکھا اور پڑھا۔ میرے عربی مضامین جامعہ ازہر کے رسالہ الزہرا میں شائع ہونے لگے۔ اس طرح میرا تعارف عرب دنیا میں ہونے لگا۔ پھر عربی زبان میں میری کتب شائع ہوئیں۔ عربی دانوں نے ان کی قدر افزائی کی۔

فرمایا ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی کے لئے صدرِ شعبہ کی جگہ کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں۔ آسامی کے لئے دو اُمیدوار تھے۔ میں اور پروفیسر احمد عابد علی۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے عربی میں ڈی فل تھے۔ ابنِ سکیت کی کتاب "اصلاح المنطق" کو انہوں نے ایڈٹ کیا تھا۔ سر سیّد احمد خان سے بھی ان کی قرابت داری تھی۔ میرے پاس مولوی فاضل کے علاوہ کوئی ڈگری نہیں تھی۔ تقرری کمیٹی میں تین افراد تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد خان وائس چانسلر، ایک مستشرق پروفیسر کالے صدر شعبۂ عربی ڈھاکہ یونیورسٹی اور مولانا سیّد سلیمان ندوی۔ دونوں خارجی ممبروں نے میری تائید کی۔ پروفیسر کالے نے کہا "میمن کے مقابلہ میں ڈاکٹر احمد عابد علی کی کوئی حیثیت نہیں"۔ اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے "معارف" اعظم گڑھ میں لکھا "آج پہلا موقعہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کو ایک اہل اور مستحق آدمی کے سپرد کیا گیا ہے"۔ فرمایا انگریزی حکومت نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر اوّل روز سے یہ انتظام کیا تھا کہ دارالعلوم علی گڑھ میں عربی زبان کے استاد کی تنخواہ ہندوستان کی مرکزی حکومت ادا کرے گی۔ جس کے بعد سے عربی میں صدر مدرس ہمیشہ انگریز یا جرمن ہوتے ہے۔

فرمایا دارالعلوم میں عربی کے پہلے مدرّس مولوی بہادر علی تھے جو ریاست الور کے رہنے والے تھے۔ پھر مولانا شبلی یہاں آئے۔ مگر صدر شعبہ پروفیسر آرنلڈ تھے حالانکہ آرنلڈ شبلی سے عربی پڑھا کرتے تھے اور شبلی نے ان سے چند سبق فرانسیسی زبان کے پڑھے تھے۔ پھر ان کی جگہ پروفیسر ٹرائیٹن (TRITON) آئے۔ (ان کے متعلق ایک لطیفہ پروفیسر مولوی بدرالدین علوی صاحب سے میں نے سنا تھا۔ وہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔ ایک روز ایک شعر میں "بعر (ب ع ر)" کا لفظ آیا۔ ٹرائیٹن نے مجھ سے اس کا مفہوم پوچھا۔ میں نے مینگنی بتایا۔ مگر وہ مینگنی کو بھی نہیں سمجھتا تھا۔ پھر شام کو میں ان کے ساتھ سیر پر گیا اور راستہ میں اونٹ کی مینگنی دکھائی)۔

درس وتدریس

مولانا عبدالعزیز میمن ایم۔ اے کی کلاس کو "ادب الکامل للمبرد" میں سے باب الخوارج پڑھایا کرتے تھے۔ خارجیوں کی تاریخ، ان کی جنگیں، ان کا تقشف اور ان کا تقویٰ وہ کچھ اس انداز سے پڑھاتے تھے کہ خارجیوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی تھی۔ بعض شیعہ لڑکے عربی میں داخلہ اس اندیشہ سے نہیں لیتے تھے کہ میمن صاحب خارجی بنا دیں گے۔ کبھی بھی دس بارہ سطروں سے زیادہ سبق نہ پڑھا جا سکا۔ کہیں نہ کہیں کوئی شعر آجاتا تو وہ اس شاعر کا پورا قصیدہ سنا دیتے تھے۔ جریر اور فرزدق کے سو سو اشعار کے قصیدے انہیں یاد تھے۔ کہیں کسی اہل علم کا نام آجاتا تھا تو وہ اس کی ساری تاریخ بیان کر دیتے تھے۔ کہیں کسی کتاب کا ذکر آگیا تو وہ اس کتاب کی مکمل تاریخ بیان کرتے تھے۔ کب لکھی گئی؟ اس کے نسخے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں؟ وائنا (آسٹریا) میں ہے یا لائیڈن (ہالینڈ) میں ہے یا بوڈلین (انگلینڈ) میں ہے یا الیسکوریال (ہسپانیہ) میں ہے یا آیا صوفیہ (ترکی) میں ہے یا کہیں اور؟ پھر کس مستشرق نے اس کو اوّل اوّل شائع کیا؟ اس نے کہاں کہاں غلطی کی ہے؟ پھر عرب ممالک میں اس کا کون سا ایڈیشن طبع ہوا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ ان معلومات کا دریا بہاتے رہتے تھے اور گھنٹے کی وسعت اپنی تنگ دامانی کا اعلان کر دیتی تھی۔ درحقیقت وہ تحقیق کے مرد میدان

تھے۔ اس زمانہ میں بھوپال کے ایک عرب خاندان کی لڑکی بھی خانگی طور پر ایم۔اے کا امتحان دے رہی تھی۔ رقیہ بنت خلیل عرب مولانا سے گھر پہ پڑھتی تھی۔

ہندوستان میں عربی ادب کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا:۔ "ہندوستان کی بدقسمتی یہ رہی کہ ان کے حصّے میں ابنِ عقیل تو آیا نہیں ابنِ حاجب آگیا۔ کہاں ابن عقیل، کہاں ابنِ حاجب"۔ کافیہ" کوئی نحو سیکھنے کی کتاب ہے۔ پھر مزید ظلم یہ ہوا کہ کافیہ کی شرح ملّا جامی یہاں مقبول ہوگئی۔ ملّا جامی کوئی نحوی ہیں۔ اسی وجہ سے اہل ہند میں عربی زبان و ادب کا ذوق پروان نہ چڑھ سکا۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا، اہل ہند کا بھی آپ پر حق ہے۔ تحصیلِ زبان عربی کے لئے دو کام نہایت ضروری ہیں، ایک مستند عربی اردو لغت ہونی چاہئیے، دوسرے مستند اور معیاری نحو کی کتاب ہونی چاہئیے۔ میرے خیال میں یہ دونوں کام آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔" فرمایا:۔ "یہ بات تو آپ کی درست ہے۔ لغت لکھنے کے لئے میں تیار ہوں۔ مگر دو شرطیں ہیں۔ اوّل یہ کہ کوئی بڑا ادارہ ضروریات کا کفیل ہو، دوسرے یہ کہ عبدالرحمٰن کاشغری ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی مجھے بطور معاون کے دیئے جائیں۔"

فرمایا عربی میں جب بھی "الکتاب" لکھا ہوا ہو تو اس سے قرآن مجید مراد ہوتا ہے یا پھر سیبویہ کی نحو کی کتاب۔ فرمایا عربی اسماء کی بعض روایات ہیں۔ جس شخص کا نام "علی" ہوگا۔ اس کی کنیت لازماً "ابوالحسن" ہوگی تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشابہت قائم ہو جائے۔ اسی طرح جس کا نام "عبدالعزیز" ہوگا، اس کے بیٹے کا نام ضرور "عمر" ہوگا تاکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مشابہت قائم ہو جائے۔ اسی لئے میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کا نام عمر رکھا ہے۔

فرمایا ہندوستان اور عرب کے بہت سارے کتب خانوں کی میں نے زیارت کی ہے۔ کسی نے مجھے انکار نہیں کیا۔ لیکن جب میں سورت میں اسماعیلی بوہروں کا مرکزی کتب خانہ دیکھنے گیا تو انہوں نے مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ایک مرتبہ میں نے مولانا کے بنگلہ پہ حاضری دی تو دیکھا وہاں ایک صاحب موجود ہیں۔ مولانا نے تعارف کرایا کہ یہ نظام

کالج حیدرآباد کے پرنسپل ڈاکٹر زاہد علی صاحب ہیں۔ آکسفورڈ سے ڈاکٹر ہیں۔ فاطمی شاعر ابن ہانی کا دیوان انہوں نے ایڈٹ کیا ہے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت"۔ کتاب سامنے رکھی ہوئی تھی۔ باہمی گفتگو سن کر پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب اس کی طباعت سے خوفزدہ ہیں۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اسماعیلی ان کو قتل کر ڈالیں گے۔ مولانا ان کا حوصلہ بندھا رہے تھے کہ ضرور چھپوائیے، کچھ نہیں ہوگا۔

سفرِ علمی۔

فرمایا میں ۱۹۳۵ء میں عالم عرب کی سیاحت پر گیا تھا۔ اس وقت دو مقصد پیش نظر تھے۔ عربی ادیبوں سے تعلقات استوار کرنا اور عربی کتب خانوں کی سیر کرنا، دوسرے حمص کے گرم چشموں میں غسل کرنا۔ بات یہ تھی کہ بچپن سے میں نے اکڑوں بیٹھ کر کتابیں نقل کی ہیں۔ اب لکھتا بھی اسی طریقہ پر ہوں۔ اس وجہ سے میری کمر میں درد رہنے لگا۔ وہ درد بہت بڑھ گیا۔ میں نے لاہور اور کلکتہ میں ڈاکٹروں کو دکھایا، مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ بعض عرب دوستوں کے مشورہ پر میں حمص کے گرم چشموں میں غسل کرنے کے لئے شام روانہ ہوگیا۔ وہاں ایک ہفتہ قیام کر کے روزانہ غسل کیا، مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ فرمایا پھر میں قسطنطنیہ گیا۔ اس زمانہ میں درد شدید تھا، اس لئے وہاں کے بڑے ہسپتال میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایک بوڑھا ترک ڈاکٹر تھا۔ اس کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہوگی۔ اس نے بڑی محنت سے اور شفقت سے میرا معائنہ کیا۔ غالباً دو روز وہ معائنہ کرتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا کہ میری دانست میں آپ کو کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک پہلو پر کام کرنے سے ایک طرف تناؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ درد ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اکڑوں بیٹھ کر ایک پیر کھڑا کر کے لکھنے کی وجہ سے یہ تناؤ پیدا ہوا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ دواؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کا علاج چہل قدمی اور سیر ہے۔ اسی روز سے میں نے سیر شروع کر دی۔ پہلے دن کمر پٹکا باندھ کر مشکل سے چند قدم چل سکا تھا۔ اب یہ میری عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ صبح و شام دونوں وقت سیر کو جاتا ہوں

اور میلوں چلتا ہوں۔ الحمدللہ اب یہ تکلیف دُور ہو گئی ہے۔

واضح رہے کہ مولانا علی الصبح سیر کر کے گھر آ کر نماز پڑھتے تھے۔ اہلِ حدیث مسلک کے مطابق غلس (اندھیرے) میں نماز پڑھتے تھے۔

فرمایا اس دور میں مصطفےٰ کمال پاشا کی اصلاحات پر سختی سے عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ وہاں ہر شخص کو ہیٹ پہننا لازمی تھا۔ ایک جید عالم دین تھے محمد اسمٰعیل۔ انہیں سر پہ ہیٹ رکھنا گوارا نہیں تھا، اس لئے وہ گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ میری آمد کی خبر اخباروں میں پڑھی۔ انہوں نے ایک قاصد میرے ہوٹل میں بھیجا اور مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور اپنی مجبوری ظاہر کی۔ پھر میں ان کے مکان پر جا کر ان سے ملا۔ بڑے غیرت مند اور باحمیت مسلمان تھے۔

فرمایا مصطفےٰ کمال پاشا کے خلاف اسّی کے قریب بغاوتیں ہوئیں، مگر وہ سب ناکام رہیں اور وہ اپنی لادینی تحریک کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ فرمایا میں قاہرہ کی گلیوں میں عبدالرحمٰن عزام بے سیکرٹری جنرل عرب لیگ کے ساتھ جا رہا تھا۔ چند لڑکوں نے میرے اوپر کنکریاں پھینکیں مجھے بڑا ناگوار گزرا، مگر عبدالرحمٰن کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کے سر پر ترکی ٹوپی ہے، آپ کے چہرہ پہ داڑھی ہے، اس لئے یہ عرب بچے آپ کو یہودی سمجھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہندوستان کے علماء تو یوں ناراض ہیں کہ یک مُشت چار انگل سے داڑھی کم ہے اور یہاں کے بچے لمبی داڑھی کی وجہ سے یہودی سمجھ رہے ہیں عجیب معاملہ ہے۔ عرب علماء بہت چھوٹی داڑھی رکھتے ہیں۔ میں جب تک قاہرہ میں رہا جمعہ نئی مسجد میں پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مسجد میں گیا۔ وہاں امام خطبہ دے رہا تھا۔ ننگی تلوار ہاتھ میں تھی۔ وہ کہتا تھا کہ جو کتاب اللہ کی اور سنّت رسول اللہ کی مخالفت کرے گا، میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی داڑھی صاف تھی۔

فرمایا مصر کے امراء (پاشا) اگرچہ زیادہ علم دوست تو نہیں ہیں، مگر قدیم کتابوں کی اشاعت میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں۔ اس طرح بحیثیت مجموعی اشاعت

علم ہوتی رہتی ہے۔ کاش یہ بات ہمارے ملک کے امراء میں بھی ہوتی۔

فرمایا شام کے دو خاندان بڑے نامور گزرے ہیں۔ ایک مفتی امین الحسینی کا خاندان، دوسرا علامہ شکیب ارسلان کا خاندان۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں ان کے اندر ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جو صاحبِ سیف اور صاحب قلم بھی تھے۔ شکیب ارسلان عربی زبان کے مایہ ناز انشاپرداز تھے۔ امیر البیان علامہ شکیب ارسلان کے متعلق وہ مصطفیٰ صادق الرافعی کا یہ جملہ دہراتے تھے کہ "گزشتہ دو سو برس میں کسی عرب ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا"۔ فرمایا وہ آزادی کے بڑے مجاہد تھے۔ شام کی آزادی کے لئے فرانسیسی حکومت کے خلاف آخر تک نبرد آزما رہے۔ پھر شام چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ میں چلے گئے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک شام آزاد نہیں ہوگا۔ میں وہاں قدم نہیں رکھوں گا۔ ان کی والدہ بستر مرگ پر تھیں۔ وہ بیٹے سے ملنے کی بے حد مشتاق تھیں۔ مگر اس وقت بھی انہوں نے غلام شام میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔ پھر ان کے بھائی عدیل ارسلان ان کی بیمار ماں کو ریل کے ذریعہ قسطنطنیہ لے کر پہنچے۔ جرمنی سے یہ بھی قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ اس طرح ماں نے ان کی شکل دیکھی۔ فرمایا یورپ میں بیٹھ کر وہ اسلام کی خدمت کرتے تھے۔ یورپ کی مختلف زبانیں جانتے تھے۔ وہاں کے رسائل میں اسلام کے خلاف جو مضامین شائع ہوتے تھے، ان کے جوابات دیتے تھے ان کی روزانہ کی ڈاک برٹش فارن آفس کی ڈاک کے برابر تھی۔

فرمایا میں بغداد یونیورسٹی میں گیا۔ وہاں کے بعض استادوں نے میرے سامنے ایک سوال پیش کیا۔ انہوں نے پوچھا بنی عباس کے مشہور جنرل افشین کا تلفظ کیا ہے! شین مفتوح ہے یا مکسور؟ میں نے تھوڑی دیر توقف کیا اور کہا کہ شین مفتوح ہے۔ انہوں نے سند طلب کی۔ میں نے کہا کہ ابوالعلا معری نے ایک شعر میں افشین کا قافیہ ذَین کے ساتھ باندھا ہے۔ فوراً معری کی کتاب "غفران" کو ڈھونڈا گیا۔ وہاں شعر مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔

مولانا کا غیر معمولی حافظہ آخر عمر تک برقرار رہا۔ مولانا سے میری آخری ملاقات اواخر ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی۔ میں بہادر آباد کراچی میں میمن منزل میں حاضر خدمت ہوا۔ اس وقت کمر میں خم آگیا تھا۔ مگر بصارت اور حافظہ دونوں بحال تھے۔ میں نے عرض کیا کہ علی گڑھ کے زمانہ میں آپ نے فرمایا تھا کہ "چائے" کا تذکرہ سب سے پہلے عرب جغرافیہ دانوں نے کیا ہے۔ یہ جملہ سنتے ہی وہ اندر کمرے میں گئے اور سیرافی کا سفرنامہ نکال کر لائے۔ جو پاکٹ ڈائری سائز پر اٹھارہویں صدی میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔ خط باریک تھا۔ اس میں مطلوبہ مقام نکال کر بغیر چشمہ کی مدد کے پڑھ کر سنا دیا۔

مستشرقین:

مولانا کام چلانے کی حد تک انگریزی زبان سمجھ لیتے تھے۔ مستشرقین کے حالات سے ان کی کتابوں سے، ان کے عیب وصواب سے پوری طرح باخبر تھے۔

فرمایا جرمن مستشرق فلوگل نے عربی ادب کی تاریخ لکھی ہے۔ ساری عمر اس کو یہ بات معلوم نہ ہوسکی مشہور عربی شاعرہ کا نام خنساء (خائے ثخذ) ہے، حنساء (حائے حُطّی) نہیں ہے۔ فرمایا پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مثنوی اسرار ورموز خودی کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ ایک مقام پر اقبال کا مصرعہ ہے ؎ چوں طفلے زنے مرکب کند۔ (بچے ٹانگوں کے درمیان لکڑی ڈال کر گھوڑا بنا کر کھیلتے ہیں)۔ اقبال کا اشارہ اسی طرف ہے۔ (انگریزی ادب میں بھی WOODEN HORSE کا تصوّر موجود ہے) مگر نکلسن نے "زنے مرکب کند" پڑھا اور بڑا گندہ مفہوم لیا۔ وہ نکلسن کو ہمیشہ یکے از خچا چرانِ انگلستان کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ پروفیسر براؤن کے متعلق کہتے تھے کہ اس کو عربی کی "ع" بھی نہیں آتی۔ مارگولیتھ کو "مارگولی" کہتے تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو بھی سخت دسست کہتے تھے۔ اسلام کے دشمن اور ملاحدہ سے انہیں سخت نفرت تھی۔ فرمایا جرمن مستشرق ڈاکٹر سالم کیرنکاؤ پندرہ زبانوں کے عالم تھے۔ عربی زبان اور ادب پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی۔ وہ مسلمان ہوگئے تھے۔ اور لندن

میں اقامت گزین تھے۔ وہ ادارہ معارف عثمانیہ کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ادارہ سے کوئی کتاب شائع نہیں ہو سکتی تھی، جب تک پروفیسر کیرنکاؤ اجازت نہ دے دیں۔ پروفیسر صاحب بڑی محنت کر کے بعض الفاظ کو اور اعلام کو مشکول کرتے تھے۔ مگر ادارہ کے طالع حضرات کا خیال تھا کہ عربی دان حضرات کو اعراب کی کیا حاجت ہے۔ اس لئے وہ ان الفاظ کو پھر معریٰ کر دیتے تھے بے چارے کی ساری محنت کو غارت کر دیتے تھے۔ فرمایا پروفیسر کیرنکاؤ کو سر راس مسعود علی گڑھ یونیورسٹی میں لے آئے تھے۔ اور درسیات اسلامیہ کا شعبہ قائم کر کے اس کا ان کو صدر نشین بنا دیا تھا۔ فرمایا پروفیسر کیرنکاؤ نے شملہ سے مجھے خط لکھا کہ یہاں ہیضہ پھیل رہا ہے اور اس کا املا حلئے حطی سے کیا (حیضہ)۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے کتنے مذموم معنی پیدا ہو گئے۔ ہندوستان کے علماء میں وہ پروفیسر مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی کے تبحر علمی کے قائل تھے۔ مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی کی ہمہ جہت تصنیفی سرگرمیوں کو وہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

فرمایا "معجم المصنفین" ایک عظیم کتاب ہے۔ یورپ میں جو کام ادارے اور اکیڈمی انجام دیتے ہیں وہ ہندوستان میں مولانا محمود حسن ٹونکی نے یہ کتاب لکھ کر انجام دیا۔ اس کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب جرمنی سے ایک مستشرق نے ایک ترک مصنف کا حال دریافت کیا۔ وہ دنیا کی بڑی بڑی جامعات میں اپنا سوال بھیج چکا تھا۔ یہاں علی گڑھ میں بھی آیا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب وائس چانسلر نے وہ سوال نواب حبیب الرحمان خان شروانی کو دیا۔ جو حیدر آباد میں صدر الصدور رہ چکے تھے۔ ان کو اس کتاب کا حال معلوم تھا۔ وہ اس سوال کو لے کر حیدر آباد گئے۔ اور وہاں مسودۂ کتاب سے مصنف کے حالات اور تصنیفات لکھ کر مستشرق موصوف کو جرمنی بھیج دیں۔ اس نے انتہائی شکر گزاری کا خط لکھا۔ اور کہا کہ ایسی عظیم کتاب آپ کے ملک میں کسی اکیڈمی نے تیار کی ہو گی۔ حالانکہ یہاں یہ کام ایک مولوی نے انجام دیا تھا۔ جو ملکوں میں اپنے پرچے جمع کرتا رہتا تھا۔ فرمایا اٹھارہ سال کی عمر سے مولانا محمود حسن نے یہ کتاب لکھنا شروع

کردی تھی۔ اور ساری زندگی اس کے لئے مواد جمع کرتے رہے۔

عرب دنیا میں قدرومنزلت

فرمایا عربی داں علمار کی سب سے بڑی انجمن المجمع العلمی دمشق (شام) میں قائم ہے۔ اس کا دروازہ ساری دنیا کے عربی داں علمار کے لئے کھلا ہوا ہے۔ رکنیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ایک مقالہ لکھ کر انجمن میں پیش کیا جائے۔ اگر انجمن کے ارکان اسس مقالہ کو معیاری قرار دیں، تب وہ شخص اس انجمن کا رکن بن جاتا ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے رکن مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان شیدا (۱۹۲۹ء) تھے۔ آج کل سید سلیمان ندوی اور میں اس کے ممبر ہیں۔

فرمایا مصری حکومت نے طے کیا کہ عربی زبان کی مشہور لغت "لسان العرب" کو تصحیح کے بعد شائع کیا جائے۔ ساری دنیا میں سے اس کے لئے تین اشخاص منتخب ہوئے۔ مصر سے استاذ شنقیطی۔ انگلستان سے پروفیسر کرنکاؤ اور ہندوستان سے مجھ کو لیا گیا تھا۔ مجھے الف کی تختی تصحیح کے لئے دی گئی تھی۔ مگر جلد ہی مصر جنگ کی لپیٹ میں آگیا۔ پھر حکومتیں تبدیل ہوگئیں۔ وہ منصوبہ تکمیل پذیر نہ ہو سکا۔

فرمایا حکومت شام نے مشہور فلسفی شاعر ابوالعلا معری کی ہزار سالہ برسی ۱۳۶۳ھ بمطابق ۱۹۴۲ء میں منائی۔ ابوالعلا معری پر میری بھی ایک کتاب ہے۔ جس کا نام ہے "ابوالعلا وما الیہ"۔ اس لئے شامی حکومت نے ایک اجلاس کی صدارت کے لئے میرا نام تجویز کیا۔ وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ صرف فوجی ہوائی جہاز جا سکتے تھے۔ حکومت شام کی درخواست پر حکومت ہند نے اپنی فوجی پرواز میں ایک سیٹ مجھے دینے کا اقرار کر لیا، مگر سر ضیاء الدین احمد خان وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں دی۔

مولانا عبدالعزیز میمن اپنے دور میں عربی زبان اور ادب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ تمام عرب ادبا اور سارے عربی مستشرقین ان کا لوہا مانتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی

نے "لغاتِ جدیدہ" (صفحہ ۲۶، اعظم گڑھ، ۱۹۳۰ء) میں تمام عربی ادیبوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ طبقہ اوّل میں امیر البیان امیر شکیب ارسلان، مصطفٰی صادق الرافعی، سیّد رشید رضا وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ طبقۂ دوم میں شیخ احمد اسکندری اور شیخ تقی الدین ہلالی وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں "ہمارے ملک کے عبدالعزیز میمن عجمی نژاد ہو کر بھی اس طبقہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اپنے لغوی اور ادبی تبحر کے لحاظ سے وہ کہیں بلند ہیں"۔ تیسرے طبقہ میں انہوں نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ڈاکٹر زکی مبارک وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا کے پاس قابلِ قدر کتب خانہ تھا۔ علی گڑھ چھوڑنے سے قبل ۱۹۵۰ء میں انہوں نے پہلے اسے مدراس سے لنکا پہنچوایا اور پھر لنکا سے کراچی منگوالیا تھا۔